جنرل ضیاء الحق سخت طیش کی حالت میں تھا۔ بار بار گھنٹی بجا کر اردلی کو پانی لانے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ شخص جو عام حالات میں غیر معمولی ٹھنڈے اعصاب کا مالک تھا، جذبات قابو میں رکھنے کا گُر جانتا تھا۔ سٹاف کیلئے صدر پاکستان کو اتنے اضطراب میں دیکھنا بے حد عجیب تھا۔ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سٹاف کو ایک اور خطرہ بھی لاحق تھا کہ کہیں اس غصے کا نشانہ ان میں سے کوئی نہ بن جائے۔ صدر کے کمرے کے باہر مکمل سکوت تھا۔ تمام لوگ دبکے بیٹھے تھے۔ صدر نے اردلی کو طلب کیا اور حکم دیا کہ ملٹری سیکرٹری کو بلاؤ۔ چند منٹ بعد، ایم ایس صدر کے کمرے میں پہنچ گیا اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ ضیاء الحق کا پارہ انتہائی بلندی پر تھا۔ ملٹری سیکرٹری سے پوچھا کہ کیا میں اس ملک کا صدر نہیں ہوں؟ اتنے عجیب و غریب سوال پر ایم ایس پریشان ہو گیا۔ انتہائی ادب سے جواب دیا۔ سر، آپ اس ملک کے بالکل صدر ہیں۔ اگلی بات قدرے مشکل تھی۔ میں کیسا صدر ہوں کہ اپنے مالی کی سرکاری نوکری میں توسیع نہیں کر سکتا۔ ایک نائب قاصد تک نہیں رکھوا سکتا۔ ایم ایس ذہین آدمی تھا۔ فوراً معاملے کی گہرائی تک پہنچ گیا مگر خوف اور ادب کی ملی جلی کیفیت میں وہیں کھڑا رہا۔ جنرل ضیاء الحق نے اس سے بات کرنی شروع کر دی۔ جونیجو کو میں نے وزیراعظم بنایا۔ اسے گمنامی سے نکال کر ملک کی سب سے بڑی کرسی پر بٹھا دیا اور آج وہ مجھے ہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ نائب قاصد اور مالی کی نوکری کی چھوٹی سطح کے کام اسے کہے، مگر وہ کہتا ہے کہ یہ میرا اختیار نہیں ہے کہ میں اس طرح کی سفارشیں کروں۔ جونیجو میرے سامنے کیسے دم مار رہا ہے۔ اسے واپس سندھڑی بھجوا سکتا ہوں۔ ملٹری سیکرٹری ہر بات جان چکا تھا۔ جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ کیونکہ تلخ حقیقت یہی تھی کہ انتظامی طاقت اور اختیار وزیراعظم کے پاس تھا۔ طویل ترین صدر رہنے کے باوجود، ضیاء الحق، قانونی طور پر کافی حد تک کمزور ہو چکے تھے۔ صدر نے اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد حکم دیا کہ آپ جا سکتے ہیں۔ ملٹری سیکرٹری نے سیلوٹ مارا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ 1988ء کے شروع کا واقعہ ہے۔ صدر ضیاء الحق، آرمی کے سربراہ بھی تھے۔ انکے پاس حکومت ختم کرنے کا اختیار بھی تھا۔ وہ قطعاً کمزور صدر نہیں تھا۔ سول ملٹری تعلقات اس حد تک بگڑ گئے کہ جنرل ضیاء نے جونیجو کی حکومت ختم کر دی۔ جونیجو صاحب، بہترین وزیراعظم ہونے کے باوجود، تاریخ کا حصہ بن گئے۔

1988ء ہی کیا، جب سے ملک وجود میں آیا ہے۔ عسکری اداروں اور منتخب وزراء اعظم اور صدور کے درمیان اچھے تعلقات نہیں رہے۔ کشیدہ کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مگر سچ یہی ہے کہ قیامِ پاکستان سے لیکر 2018ء تک ان تعلقات پر سوالیہ نشان ہی رہا ہے۔ مگر اب پہلی بار صورتحال انتہائی مختلف نظر آرہی ہے۔ سول ملٹری تعلقات ناقابل یقین حد تک بہترین ہیں۔ یہ سب کچھ جمہوریت کیلئے، بلکہ پورے ملک کیلئے خوش آئند ہے۔ عمران خان کو وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد جی ایچ کیو میں طویل بریفنگ دی گئی۔ بریفنگ اپنی حیثیت میں حد درجہ اہم تو ہے ہی۔ مگر اسکا ظاہری پہلو بھی بے حد اہم ہے۔ آرمی چیف نے وزیراعظم کو سیلوٹ مارا۔ بلکہ انکے تمام سٹاف افسروں نے وزیراعظم کو سیلوٹ مار کر خوش آمدید کہا۔ پھر باقاعدہ اس لمحہ کو تصویر کی شکل میں نمایاں طریقے سے میڈیا پر ریلیز کیا گیا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا سیلوٹ مارنا اور اسے عوام تک دکھانا اہم ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر سیلوٹ نہ مارا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف یاداشت کیلئے عرض کرتا ہوں کہ متعدد بار ایسے ہوا ہے کہ آرمی چیف نے منتخب وزیراعظم کو سیلوٹ نہیں مارا۔ استدعا ہے کہ آپ اس نازک معاملے کی تحقیق خود ہی کر لیجئے۔ دوسری بات بھی اہم ہے۔ عمران خان اور انکی ٹیم کو اس کمیٹی روم میں بریفنگ دی گئی، جہاں آرمی چیف بذات خود، کور کمانڈرز کی نشست کی سربراہی کرتے ہیں۔ یہ محفوظ ترین کمرہ ہے اور اس میں جو بھی گفتگو ہوتی ہے، وہ امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔ فوجی سربراہ نے پہلی بار، اپنی کرسی کو وزیراعظم کیلئے استعمال ہونے کی اجازت دی۔ کم از کم تیس برس میں یہ واقعہ پہلی بار دیکھا ہے۔ آرمی چیف نے عمران خان کی سربراہی میں چھ سات گھنٹے کی طویل میٹنگ کی۔ اس میں عسکری اور سویلین قیادت پیہم موجود رہی۔ یہی ناقابل یقین حقیقت، 6 ستمبر کو بھی دیکھنے میں آئی۔ جب فوج نے "یومِ شہداء" پر عمران خان کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب میں مدعو کیا اور پھر آرمی چیف کی تقریر کے بعد، منتخب وزیراعظم کو تقریر کرنے کی دعوت دی۔ آج تک کی تاریخ میں انتہائی یقینی طریقے کہا جا سکتا ہے کہ منتخب وزیراعظم اور عسکری اداروں کے باہمی تعلقات حد درجہ اعتماد اور یقین پر ہیں۔ اس طرح کے خوشگوار تعلقات پہلے کبھی بھی دیکھنے کو نہیں ملے۔

اس سے پہلے کہ بات کو آگے بڑھاؤں۔ ان دانشوروں اور لکھاریوں کی داخلی صورتحال پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ جنکا مفاد ہی تلخ اور بگڑے ہوئے سول ملٹری ریلیشن شپ پر ہے۔ ان میں سے اکثریت، اداروں کے درمیان جھگڑے کو ہوا دیتے ہیں اور اسکے بعد ایک فریق کے ہمدرد بن کر مراعات لیتے ہیں۔ کبھی یہ "سویلین بالادستی" کو مرکزی نکتہ بنا کر پارلیمنٹ کو طاقت کا مرکز قرار دینے کی بحث میں پورے نظام کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ انکا مقصد کسی منتخب وزیراعظم کی طاقت کو بڑھانا ہوتا ہے نہ ہی یہ جمہوریت کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت، اپنے مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ نتیجہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ ایک فریق مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ حکومت ختم ہو جاتی ہے یا کر دی جاتی ہے۔ اسکے بعد، یہی دانشور اپنا پرانا چورن نئے خریداروں کو بیچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ پہلی بار ہو رہا ہے کہ سویلین اور فوجی قیادت باہمی اعتماد کے رشتے میں پیوست نظر آرہے ہیں۔ یہ طبقی حضرات، اس مثبت صورتحال پر حد درجہ بے قرار نظر آرہے ہیں۔ ان کی بے صبری اس وقت قیامت بن کر انہی کو ذہنی مشکل میں ڈال رہی ہے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کریں۔ لہٰذا، ان قصے کہانیوں کو پھیلا رہے ہیں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہی فقید المثال یگانگت، امریکی وزیر خارجہ کے دورہ میں بھی دیکھنے میں آئی۔ پہلی بار پاکستانی قیادت نے کسی قسم کی مالی امداد کی بات نہیں کی۔ یہ بھی امریکی توقعات کے بے حد برعکس تھا۔ خیر، معاملات بہتر طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ متعدد سنجیدہ معاملات حل ہو جائیں گے۔

جس طرح بہترین سول ملٹری تعلقات ناقابل یقین ہیں۔ بالکل اسی طرح بطور، وزیراعظم عمران خان کا ذاتی طرزِ عمل، ہماری پرانی منفی روایات کے بالکل برعکس ہے۔ پہلی بار کسی وزیراعظم نے یہ بتانے کی جرات کی ہے کہ اسکی سرکاری رہائش گاہ میں کتنے ملازم ہیں۔ کتنی بیش قیمت گاڑیاں ہیں اور غریب ملک کا وزیراعظم، کس شاہانہ انداز میں رہتا ہے۔ عمران خان نے نہ صرف عیش و عشرت کے اس پوشیدہ پہلو کو عیاں کیا بلکہ اسکے ساتھ ساتھ، اس پر تعیش ماحول سے کنارہ کشی بھی اختیار کر لی۔ جو حضرات فرما رہے ہیں کہ ایم ایس کا چار کنال کا گھر، وزیراعظم ہاؤس جتنا آراستہ اور بہترین ہے۔ معذرت کے ساتھ وہ مبالغہ آرائی فرما رہے ہیں۔ وزیراعظم ہاؤس کی شان و شوکت کے سامنے، ایم ایس کی رہائش گاہ حد درجہ سادہ ہے۔ مگر یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغربی ممالک میں صدور اور وزراء اعظم بہت زیادہ سادہ سی سرکاری زندگی گزارتے ہیں۔ آسٹریلیا سے لیکر یوکے اور سویڈن سے لیکر جرمنی تک تمام مقتدر لوگ عام آدمی کی طرح زندگی میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ جرمنی کی خاتون چانسلر، آج بھی گھر کا ذاتی سودا سلف، اپنے شوہر کے ساتھ جا کر خود خریدتی ہے۔ اپنا سامان خود اُٹھاتی ہے۔ ذاتی گاڑی خود چلاتی ہے۔ کسی پروٹوکول کے بغیر سارا ذاتی کام کرتی ہے۔ مگر ایک بات کا وہاں بھی از حد خیال رکھا جاتا ہے۔ سادگی اپنی جگہ، مگر صدر اور وزیراعظم کی سیکیورٹی انتہائی حد درجہ سخت ہوتی ہے۔ سادگی کی طرف جو قدم عمران خان نے اُٹھایا ہے، وہ ہمارے جیسے ملک کیلئے اجنبی ہے۔ مگر مغرب تو بہت عرصے سے اپنے حکمرانوں کو سادگی کی طرف مائل کر چکا ہے۔ ہمارے اندرونی حالات میں یہ سادگی، بہر حال قابل تعریف ہے اور قابل تقلید بھی۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا یہی جذبہ صوبائی حکومتوں کی سطح پر بھی موجزن ہوتا ہے یا نہیں۔ سندھ اور بلوچستان کی حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں سرکاری سطح پر سادگی کو ترویج دینا ناممکن ہے۔ بہر حال کبھی کبھی ناممکن کام بھی وقوع پذیر ہو جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح پانی اور سستی بجلی مہیا کرنے کی مہم بھی حد درجہ اہم ہے۔ ڈیم کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر سوال اُٹھتا ہے کہ گزشتہ حکومتوں نے اس کو اہمیت کیوں نہیں دی۔ عرض کرتا چلوں کہ آبی ذخائر کو "سی پیک کا حصہ" کیوں نہیں بنایا گیا۔ کیا "اورنج ٹرین" ایک ڈیم سے زیادہ ضروری تھی۔ مگر اب گلہ کرنا فضول ہے۔ ڈیم کیلئے چندہ کی مہم چلانا انتہائی ضروری ہے۔ تارکین وطن کو اس میں شامل کرنا بے حد اہم ہے۔ تمام کام اس خلوص نیت سے پہلی بار ہو رہے ہیں کہ لگتا ہے کوئی خواب دیکھا جا رہا ہے۔ یقین فرمائیے! اچھائی کے ان بنیادی کاموں پر یقین نہیں آرہا!